شریف کنجاہی کی لکھی گئی ایک بہت ہی پرانی کتاب (تاریخ گجرات اور لفظوں کی عینک) جس میں انہوں نے تحصیل پھالیہ جو اس وقت ضلع گجرات کی تحصیل تھا اس کے مختلف دیہاتوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی تاریخ لکھی ہے کتاب کے مین صفحہ پر بھی منڈی بہاؤالدین کے کچھ دیہاتوں کا نقشہ ناموں کے ساتھ درج ہے ،

(ضرور پڑھیں)

خصوصی سرچ کاوش : زاہد عمران تارڑ گھنیاں تحصیل پھالیہ

Imagitor

تاریخِ گجرات

اور

لفظوں کی عینک

شریف کنجاہی

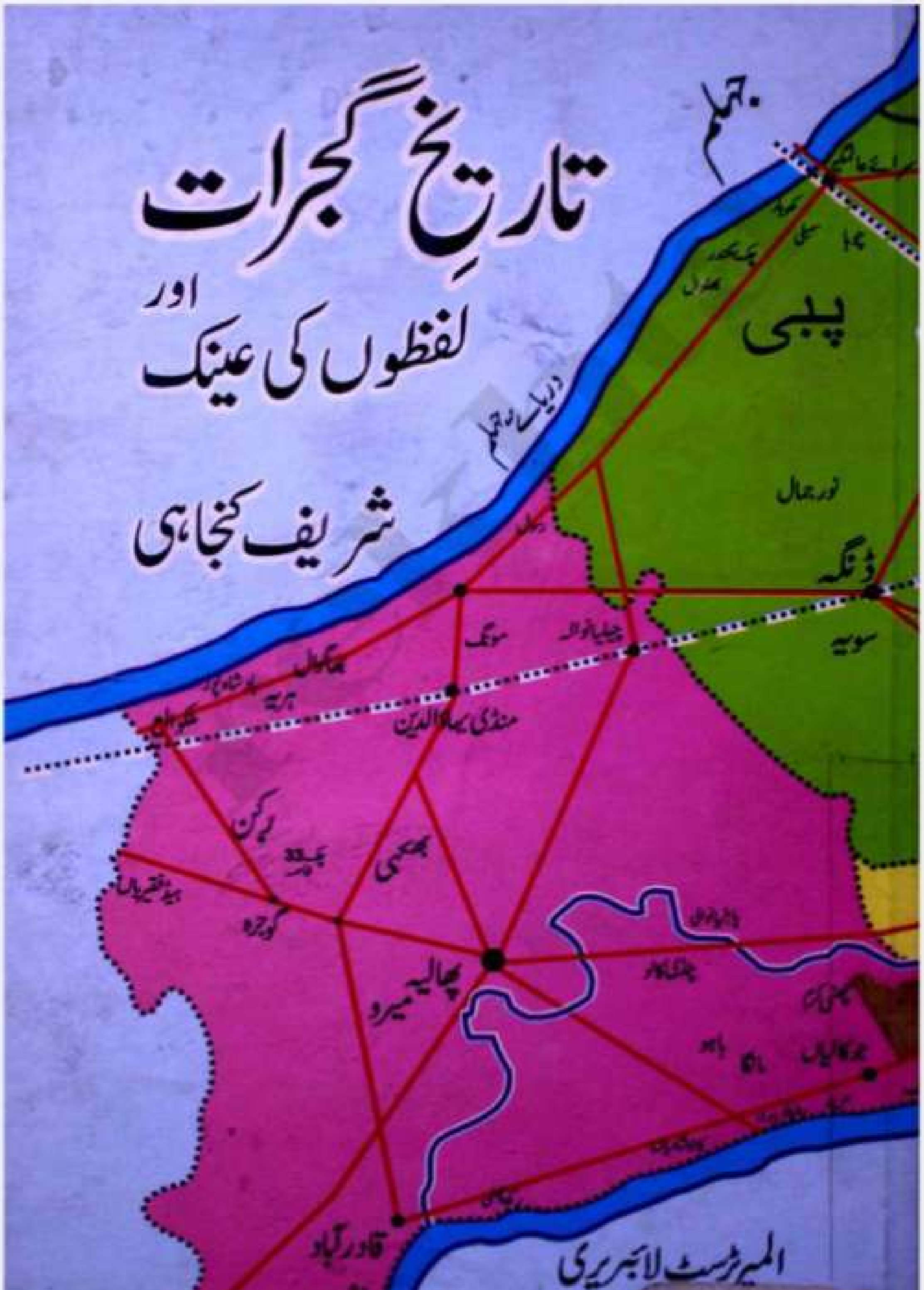

المیر ٹرسٹ لائبریری

(پاکستان)

پھالیہ کی داستان

پھالیہ کو عام طور پر سکندر کے گھوڑے کی دفن گاہ بتایا جاتا ہے۔ پنجاب گزیٹیئر کے مطابق دریائے جہلم اس کے شمال مغرب سے گزرتا ہے اور چناب جنوب مشرق کی جانب سے اس کو حد بند کرتا آیا ہے۔ لیکن اس گزیٹیئر میں گھوڑے والی داستان مذکور نہیں ہے اور بوسی پھالیہ (BuciPhala) کو جہلم کنارے کا ایک شہر بتایا ہے اور یہی بات درست بھی لگتی ہے کہ Buciphala (جسے جہلم گزیٹیئر میں Buhiphalia لکھا گیا ہے) جہلم کنارے کے ایک نگر کا نام تھا۔ اور چوں کہ C کی آواز K کی آواز بھی بن جاتی ہے اس لئے نام کو بوسی پھالا بھی سمجھا جاسکتا ہے اور بوکی پھالا بھی۔ اس کی ایک مثال سائپرس (Cypris) ہے جسے قبرص بھی لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ چنانچہ اس جزیرہ کے شمالی حصہ کو جو ترکوں کے زیر اثر ہے قبرس (قبرص) ہی کہا جاتا ہے اور وہاں سے شائع ہونے والے سرکاری ماہنامہ کا نام Kibris ہے۔ دونوں صورتوں میں پھالا ہی نام کا آخری حصہ ہے اور چونکہ قدیم پنجابی یعنی دراوڑی اور آریائی پنجابی کی طرح یونانی میں بھی ف کی آواز نہیں ہے اس لئے پھالا ہی اس جگہ کے نام کا آخری حصہ ہو گا۔ لیکن جہاں Buciphala کو سکندر کے مخصوص گھوڑے کا نام بتایا ہے وہاں کسی نے بھی یہ نہیں بتایا کہ جہلم کنارے کے نگر کو بوسی پھالا (یا) بوکی پھالا کیوں کہا گیا تھا اور کب کہا گیا تھا۔ انیسویں صدی کے آخری ایام میں یعنی 1888ء میں چھاپی جانے والی کسیل یونیورسل ہسٹری میں ضرور اشارہ ملتا ہے کہ سکندر کامرانی کے بعد ایک ماہ تک سیر وشکار میں لگا رہا اور اس نے دریا کے کنارے دو بستیاں بسائیں جن میں سے ایک کا نام نکایا (Nicaia) رکھا اور دوسرے کا بوسے پھالا (Buciphala) اور یہ بستی اپنے گھوڑے کی یاد میں بسائی گئی تھی ۔ یہ بات اگر درست مان لی جائے تو پھر اس پھالیہ کا مفہوم پھر سے تلاش کرنا پڑتا ہے جو اس دوآبے کا تحصیلی قصبہ گنا جاتا ہے۔

میں نے آج سے تقریباً دس سال پہلے جشن گجرات کے سلسلہ میں چھاپے گئے ایک بروشر میں اشارہ کیا تھا کہ جرمنی میں دریائے رائن (Rhine) کے کنارے ایک جگہ بلکہ

اس نام اور جگہ کو بھی سامنے رکھ کر تلاش کرنا چاہیئے کہ دونوں ناموں کا تعلق دو دریائی علاقوں سے ہے۔ تحقیق اور تجسس کا اسے افلاس ہی کہنا چاہیئے کہ آج جب بیسیوں لوگ جرمنی میں جا کر رہ رہے ہیں اور اس دوآبہ سے تعلق رکھتے ہیں کسی نے بھی معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ جرمنی کی اس دریائی جگہ کو ویسٹ پھالیہ (یا) ویسٹ فالیہ کیوں کہا جاتا ہے۔ جرمنی زبان کی ایک ڈکشنری کے حوالہ سے میں اسی قدر معلوم کر سکا ہوں کہ فال اور فالن کے جہاں بہت سے مفہوم ہیں ان میں سے چند ایک یہ بھی ہیں۔ (۱) دریا وغیرہ میں گر پڑنا۔ (۲) ڈھلوان بنتے بناتے جانا (۳) لڑائی میں مارا جانا (۴) میدان میں عزت سے جان دینا یا لڑ جانا۔ (۵) دریا اور سمندر وغیرہ میں جا گرنا۔ یوں میرا خیال ادھر جاتا ہے کہ ویسٹ پھالیہ سے وہ علاقہ مراد تھا جدھر سے پانی بہتا ہوا دریائے رائن میں جسے رین بھی بولتے ہیں اور جو ہماری جانب کے لفظ رانیوال سے بہت ملتا ہے) جا گرتا ہو گا اور یہی صورت پھالیہ کی تھی بلکہ آج بھی ہے کہ اس قصبہ تک کا سارا پانی چناب اور جہلم میں جا گرتا ہے۔ اسی مفہوم میں سکندری گھوڑے کا مفہوم بھی میرے خیال میں پوشیدہ تھا اور اس سے وہ گھوڑا مراد تھا جس نے لڑتے ہوئے میدان میں جان دے دی تھی۔ یوں اس گھوڑے کو یہ نام جنگ جیتنے کے مرحلہ میں دیا گیا ہو گا۔ یہاں اس مرثیہ کو بھی سامنے رکھیں جو انیس نے عباس علمدار کی شان اور یاد میں لکھا تھا اور جس کا ایک بند اس طرح ہے۔

گردن ہلا کے کہنے لگا اسپ تیز گام
بے ذوالجناح مجھ پہ بھی پانی ہے یہ حرام
اس قوم سے نہیں کہ ڈبو دوں وفا کا نام
آقا ابھی حسین کے بچے ہیں تشنہ کام
مطلب یہ ہے کہ ذکر وفا چار سو رہے
ترخشک لب نہ ہوں تو نہ ہوں آبرو رہے

یہ باتیں ظاہر ہے کہ (راقم کے مطابق) گھوڑے نے نہیں کہی تھیں لیکن اس کی داخلی کیفیت وہی تھی جو مرزا انیس نے بیان کی تھی۔ اور اسی طرح اگر ذکر وفا میں سکندری

امکان یہ بھی ہے کہ جگہ کا نام وہی ہو جو یونانیوں نے لکھا ہے لیکن اس کے مفہوم کو ان کے تاریخ نویس اپنی طرف لے گئے ہوں۔ ہمارے اپنے دوآبہ کی زبان کے حوالہ سے یہ لفظ بو کی پال ہو گا جس میں بک (بوک) میں دی آبی حوالہ موجود تھا جو ہم کو بگ میں ملتا ہے اور جو انسان کا پانی پینے کا پہلا برتن تھا۔ چکوال کی جانب ایک برساتی نالہ کا نام بھی اسی حوالہ سے بگرالہ تھا اور آج بھی ہے کہ میرے ایک دوست میاں رشید احمد اور ان کے بھائی کرامت حسین نے 1981ء میں اس کو پل آشنا کیا گیا تھا۔ پال میں حفاظتی مفہوم بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے اور پتن والا مفہوم بھی اور مجھے یاد ہے کہ 1927ء میں جب میرے والد صاحب جلالپور شریف میں ملازم تھے تو سردیوں میں وہ اکثر پایاب ہی منڈی بہاؤالدین سے پار چلے جاتے تھے لیکن گرمیوں میں جب پانی چڑھا ہوتا تھا تو کشتی کے ذریعے پار جایا کرتے تھے اور چونکہ اسی نواح میں ایک جگہ کا نام بھکھی ہے اور ایک کا بیسہ ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ بھو کی پال (بھکھی پال) اس پتن کا نام ہو گا جسے یونانیوں نے مرضی کے مطابق بدل دیا ہو گا۔ بھکھی کے متعلق یہ بھی ذہن میں رہنا چاہیے کہ پٹیالہ ریاست کی ایک بستی کا نام بھی بھکھی ہے اور اسے بھی آبی حوالہ ہی سے یہ نام دیا گیا تھا۔ لیکن اس لفظ کے مقامی مفہوم کو نہ جانتے ہوئے اسے سمجھنے میں گڑبڑ ہو گئی تھی کہ اہم ترین مؤرخ ایرین (Arrian) سکندر سے صدیوں بعد یعنی دوسری صدی عیسوی میں ہو گزرا ہے اگرچہ اسے ایک اہم حوالہ کی کتاب میں سکندر کا درباری تاریخ نویس بتایا گیا ہے۔ اس طرح اگر ایرین کے کانوں نے غلط سنا ہو اور غلط سنے ہوئے کو صحیح سمجھ لیا گیا ہو تو تعجب کی بات نہیں کہ اسے آریائی پنجابی کا سکالر کسی نے بھی نہیں کہا اور اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ بوسی اور بو کی کا کوئی اور مفہوم بھی ہو سکتا تھا۔ اگر اس نے باسفورس کو ہی سمجھنے کی کوشش کی ہوتی یا بوسیہ کو ہی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ بوسی میں بیل کا نہیں پانی کا حوالہ تھا۔ چنانچہ بوسیہ ایک دریا ہی کا نام ہے جس نے اس علاقہ کو اپنا نام دیا تھا۔ لیکن ان ایام میں چونکہ آج کی سی تاریخی اور جغرافیائی سہولت موجود نہیں تھی اس لئے ایرین کو الزام بھی نہیں دیا جا سکتا بلکہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ پنجاب بھر میں اس دور کے حوالہ والی کوئی کتاب نہیں ملتی جو اس دور میں لکھی گئی ہو۔ اور چونکہ ایک حالیہ اہم تاریخی

خلاصہ پیش کرنا ضروری خیال کرتا ہوں جس سے وضاحت ہو جاتی ہے کہ یہ معرکہ غزنوی دور تک پہنچتے پہنچتے کیا شکل اختیار کر گیا تھا اور چند صدیوں کے بعد اس کا حلیہ کیا ہو گیا تھا۔ فردوسی کے مطابق پورس سکندر کے ہاتھوں دست بدستی جنگ میں مارا گیا تھا جس سے اس داستان کی بنیاد کھوکھلی ہو جاتی ہے کہ اسے سکندر کے پاس زخمی لایا گیا تھا اور دونوں میں سوال جواب بھی ہوئے تھے۔ فردوسی کی بتائی ہوئی داستان شاہنامہ میں اس طرح عنوان دے کر بیان کی گئی ملتی ہے۔

۱۔ راندن سکندر لشکر راسوی فور ہندی ونامہ نوشتن بدو (فور ہندی سے پورس مراد ہے۔ ش)

۲۔ پاسخ نامہ سکندر از فور (یعنی پورس۔ ش)

۳۔ آراستن سکندر لشکر را بر زم فور ہندی

۴۔ رزم لشکر سکندر با لشکر فور وکشتہ شدن فور بدست سکندر

اس داستان کو بھی وثوق نہیں کہا جا سکتا کہ اسی داستان کو نظامی گنجوی نے 1191ء میں سکندر نامہ کے اندر یوں بیان کیا ہے کہ سکندر نے رزم آرائی سے پہلے پورس کی جانب پیغام ارسال کیا تھا جس کا اثر فردوسی والے خط سے مختلف نکلا۔ یہاں ایک انوکھا اضافہ ہے کہ پورس نے ایک خواب دیکھا جس نے اسے خوف زدہ کر دیا اور اس کے اندر خیال پیدا ہوا۔

کہ از کینہ باشاہ دارا چہ کرد زحد جبش تا بخارا چہ کرد

یعنی اس نے محسوس کیا کہ دارا کو سکندر کے ساتھ تصادم میں کیا حاصل ہوا۔ ہم نشینوں نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی اور بات اس اعتراف پر ختم ہوئی کہ سکندر خداوند و من چاکرم۔ جواباً سکندر نے بھی اسے یقین دلایا کہ

بشیریں سخن ہائی جاں پرورت خداوند بودم شدم چاکرت

اس سکندر نامہ کے مطابق بھی دونوں ایک دوسرے سے لڑتے ہی نہیں تو وہ سوال جواب کہاں سے ابھر آئے جو ضرب المثل بن چکے ہیں۔ اسی طرح سکندری گھوڑے کے زخموں کی تاب نہ لا کر مر جانے کی داستان بھی غیر حقیقی ہو کر رہ جاتی ہے اور پھالیہ کا مفہوم ہمیں پھر سے تلاش کرنا ہو گا۔

چل بسنے سے کہانی جس کسی کے ہاتھ آئی اس نے من مرضی کی کانٹ چھانٹ سے کام لیا اور اگر یونانی اور افغانی یا گنجوی باتوں کو یک جا کر کے سمجھنے کی کوشش کریں تو بات پریشان سے پریشان تر ہو جاتی ہے اور صرف فردوسی والی داستان اس کی آبرو رکھتی ہوئی ملتی ہے۔ لیکن شاہنامہ بھی محمود اور فردوسی کے بعد قلمی لکھی جانے والی کتابوں کے ان ایام میں غزنویوں کے غوریوں کے ہاتھ پٹ جانے کے بعد ناپسندیدہ کتاب سمجھی گئی ہوگی اور نظامی جس دربار سے وابستہ تھا اس کا مزاج محمودی نہیں تھا بلکہ اس کی خاموش تفسیر و تفصیل کہ آشتی بہ ہمہ حال بہتر از جنگ است۔

ادھر پورس کا انجام کہیں بھی ایسا نہیں ملتا کہ اسے پورس کے لئے قابل فخر خیال کیا جا سکے۔ سکندر سے اس کی جنگ جوئی یا صلح جوئی کا واقعہ 326ق م کا بتایا جاتا ہے اور چار سال بعد ہی ہم چندر گپت موریہ کو ابھرتے دیکھتے ہیں اور پورس کے متعلق کوئی دکھ سکھ کی بات سامنے نہیں آتی۔ کیا اس سے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ وہ میدان جنگ میں مارا گیا تھا اور یوں بے داستاں ہو کر رہ گیا تھا۔ جس کا فائدہ چندر گپت نے اٹھایا۔ یا یہ خیال کیا جائے کہ اس کے سمجھوتے کو (جیسا کہ یونانی اور ایران داستانوں سے پتہ چلتا ہے) مقامیوں نے پسند نہ کیا ہوگا۔ ماسکو سے شائع ہونے والی ہسٹری آف انڈیا میں اشارہ ملتا ہے کہ چندر گپت کا راستہ پورس کے مارے جانے سے صاف ہو گیا تھا لکھنے والوں نے یہ نہیں لکھا کہ وہ کب مارا گیا تھا۔ اندازاً 317ق م سے پہلے پہلے کہا جا سکتا ہے۔ جب چندر گپت کی تاجپوشی ہوئی تھی۔ پنجاب گزیٹیئر نے بھی لکھا ہے کہ "سکندر کی موت کے بعد ایک سیلاب بغاوت اُمڈ آیا تھا" اور اس سیلاب کے ایام میں اگر پورس زندہ ہوتا تو وہ صورت حال کو اپنے موافق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوا ضرور کسی نہ کسی روپ میں سامنے آتا اور یہ دوآبہ موریہ خاندان کی جھولی میں کسی پکے ہوئے پھل کی طرح نہیں گر سکتا تھا عجب اتفاق ہے کہ اس کے صدیوں بعد ہم انیسویں صدی میں اس دوآبہ کی جہلمی جانب مقامی اور غیر مقامی معرکہ ہوتے دیکھتے ہیں اور اس معرکہ میں بھی مقامی ہی ہار جاتے ہیں۔ لیکن پھالیہ سے کیا مراد تھا؟ میرے خیال میں یہ آریائی پنجابی یا دراوڑی پنجابی کا لفظ تھا۔ بلکہ میں اسے دراوڑی لفظ ہی کہوں گا۔ کیوں کہ دراوڑی ڈکشنری کے مطابق پال سے بند باندھنا مراد ہے اور پالیہ (Paliye) سے فوج بھی مراد ہے۔ بستی

بھی مراد ہے ۔ ٹھہرنے کی جگہ بھی مراد ہے اور پھالیہ قدیم ایام میں ایک ایسی ہی جگہ تھی جہاں سے آگے دریائی رقبہ شروع ہو جاتا تھا۔پالائم (Palaiyam) سے فوجی کیمپ بھی مراد ہے اور ناممکن نہیں ہے کہ پھالیہ ایک ایسی ہی جگہ ہو کہ یہاں ایک قلعہ نما جگہ کے کھنڈر ان ایام میں بھی نظر آتے تھے جب میں (1953 سے 1957 تک) وہاں کے سکول میں پڑھاتا تھا اور کبھی عہد میں بھی اس جگہ کا کہیں حوالہ نہ ملنا اشارہ کرتا ہے کہ پھالیہ کی سیاسی اہمیت جاتی رہی ہو گی کہ آنے جانے والے قادر آباد کے راستے دوآبہ رچنا میں چلے جاتے ہوں گے ۔ پورس کو بھی ہم دراوڑی حوالہ سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اس سے کشتیوں اور جہازوں کا مالک مراد تھا۔ کیوں کہ پارو (Paru) سے جہاز بھی مراد ہے اور کشتی بھی مراد ہے۔ اس سے مرد میدان بھی مراد تھا اور یہ نام بھی ذاتی نہیں تھا صفاتی تھا۔ عجیب یہ کہ اس کا ایرانی اور عربی روپ "فورو" انگریزی میں لفظ فیری (Feary) کے بہت قریب ہے اور اس سے کشتی کے ذریعے پار جانا مراد ہے۔ ناممکن نہیں کہ پورس اس دریا کے پتنوں کا مالک ہو اور پنجاب گزیٹیئر جلد اول میں اشارہ ملتا ہے کہ سکندر نے پورس کے اس اختیار کو چیلنج کیا تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر پانی پار نہیں کیا جاسکتا۔

پھالیہ کو ہم پالیہ کا بدلا ہوا روپ خیال کریں تو اس میں سے پانی کا حوالہ ابھرتا ہے اور پلک کو ہم اسی لئے پلک کہتے آئے ہیں کہ اس کے ذریعے پانی یعنی آنسو آنکھ سے نکلتے رہے ہیں ۔پالا سے سردی بھی اسی لئے مراد تھی کہ پانی یعنی بارش فضا میں سردی پیدا کر دیتی تھی ۔ خصوصاً سردیوں کی بارش ۔ اس طرح ممکن ہے پھالیہ کو یہ نام پانی کے کنارے ہونے کے باعث ملا ہو کہ پھالیہ کے پاس سے جو نہر سی گزرتی ہے اس سے پہلے پھالیہ کا بیشتر حصہ سیم والا علاقہ تھا اور اس سیم کی علاقہ کے کم آباد ہونے کے باعث کمی نہیں بیشی ہی ہوتی گئی۔ پھالیہ کا کئی پھالیوں میں بٹا ہونا بھی یہی اشارہ کرتا ہے کہ اس سے آب کنارے کی بستی ہی مراد تھی اور ہمارے دوآبہ سے دور بھی ایک دریا کا نام پالر (Palar) ہے جو میسور کے پاس سے سمندر میں جاگرتا ہے تو اسی جنوبی ہند میں ایک جگہ کا نام پالی گھاٹ ہے۔ پالو نام کی ایک جگہ حیرہ روم کی ایک شاخ ایڈریاٹک کے کنارے پر ہے تو ممالک متحدہ امریکہ میں ایک دریا کا نام پالوس (Palouse) ہے۔

تاہم چند نام میں نے اس لئے تحریر کئے ہیں کہ شاید کسی مزید کھوج لگانے والے کے لئے مفید رہ سکیں۔ کیوں کہ آج سے صدیوں پہلے کی کسی بستی کے نام کا مفہوم وثوق کے ساتھ جانا یا بتایا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ جہاں پالستین (فلسطین) سے یہودیوں کا مقدس علاقہ مراد لیا جاتا ہے وہاں ممالک متحدہ امریکہ کے ایک قصبہ کا نام بھی پالستین (Palistine) ہے اور دونوں ناموں میں ایک ہی بات مشترک ہے کہ وہ پانی کے کنارے پر ہیں۔ جہاں تک پھالیہ کا تعلق ہے نلکوں بلکہ ٹیوب ویل کی سہولت سے دوآبہ کی کتنی ہی اور بستیوں کی آبی پہچان کو ختم کر دیا ہے یا دھندلا دیا ہے کہ اب خال خال آبادیوں میں جوہڑ ایک ضرورت کے طور پر پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ پیارا کے پاس سے ایسی کوئی ندی نہیں گزرتی جس نے کبھی اسے یہ نام دیا تھا کہ ترکی میں برنج یعنی چاولوں کو پیرنج اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ پیر یعنی پانی کی فصل ہے اور پیڑنا سے بھی اسی پس منظر میں گنے سے رس نکالنا مراد لیا جاتا ہے۔ بلکہ براہوی یعنی یہاں کی قدیم درواڑی زبان میں پیر سے بارش مراد ہے (جو ندی نالوں کو زندہ کر جاتی ہے) یہی صورت گجرات کے محلّہ غریب پورہ کی ہے جسے کبھی یہ نام آبی حوالہ سے دیا گیا تھا اور اب جس کا وہ تالاب بھی بے آب ہو چکا ہے جس کی سیڑھیوں پر میرے زمانہ طالب علمی میں ہندو عورتیں خود نہاتی تھیں جامے دھوتی تھیں اور اگر کسی وقت یہاں بلدیہ کی عمارت کھڑی ہو گئی تو شاید کسی کو یاد بھی نہ رہے کہ کبھی اس جگہ ایک ایسا تالاب تھا جس کی گہرائی میں سے مہاتمابدھ کا مجسمہ نکلا تھا کہ ایلیٹ کی داستان گجرات کا اردو ترجمہ بھی شاید ریاض مفتی صاحب دوبارہ چھپوانے کی زحمت نہ کریں اور جولائی 1997ء کے پانچ سو نسخے کس کس کی تشنگی دور کریں گے۔

لیکن پھالیہ کو اگر ہم مقامی یعنی قدیم پنجابی لفظ ہی خیال کریں تو پھر پھالیہ (پالیہ) کی اصل پالی بھی ہو سکتی ہے جس سے دراوڑی میں کٹیا مراد ہے خصوصاً چرواہوں کی جھونپڑی بلکہ اس سے جانگلیوں کی بستی بھی مراد تھی۔ اور ممکن ہے پھالیہ میں ایسا ہی کوئی مفہوم پوشیدہ ہو۔ لیکن پالائم (Palaiyam) سے فوج مراد تھی اور ایسی بستی بھی جس کو پہاڑیوں نے گھیرا ہوا ہو (یعنی پہاڑیوں نے جن کی حفاظت کی ہو۔ ش) اسی حوالہ سے پالیہ سے فوجی کیمپ

انھے (عینے والا) سے کیا مراد تھا

کدھر کٹھالہ شیخاں اور بھکھی والے آبی حوالہ کے ٹھکانوں کے پاس ہی ایک بستی کو قدیم ایام میں یعنی پاکستان بن جانے سے پہلے "انھے" کہا جاتا تھا اور میرے پاس موجود بستیوں کے ناموں کی فہرست میں اسے اسی طرح لکھا گیا ہے جب میں 1953ء میں بسلسلہ ملازمت گورنمنٹ ہائی سکول پھالیہ میں گیا اور وہاں 1957ء تک رہا تو اسے اسی طرح بولتے ہوئے پایا تھا۔ لیکن شیطانیاں چوہے مل اور ڈوبیناں والی کی طرح اس بستی کا نام بستی والوں کے لئے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا جس کا حل وہاں کے ایک عالم دین اور حافظ قرآن نے جن کا نام مجھے یاد نہیں رہا کہ لوگ احتراماً ان کو انھی والے حافظ صاحب ہی کہا کرتے تھے یہ نکالا کہ یہ لفظ اصل میں عینی تھا جسے جاہل لوگوں نے انھی بنا دیا تھا۔ عینی سے مفہوم آنکھ کی طرف ہی لے جایا جاتا تھا اور یوں اس معنی کہ یہ دیدہ وروں کی بستی ہے۔ میری طرح کے بہت سے کرید کار اسے من مرضی کے معنی دیتے آئے اور ابھی تک دیتے ہیں لیکن جب میں نے سیکنڈے نیویائی علاقہ کے الفاظ میں دلچسپی لینا آغاز کیا تو اس پس منظر میں کہ یہ بستی بھی لب آب تھی ایک عجیب سانکتہ سامنے آیا اور میں نے اسے اَ(a) کا مرکب لفظ پایا۔ اَ(a) سے آئیس لینڈ میں دریا اور ندی یعنی کوئی سی آبگاہ مراد ہے۔ اسی کے ساتھ ر ملا کر آر بنائیں تو مفہوم سال یعنی برس بن جاتا ہے اور دریا بھی بلکہ ارس (عرس) سے بھی سال ہی مراد ہے اور یوں کسی بزرگ کے مزار پر سالانہ میلا شاید اسی حوالہ سے عرس (ارس) کہلاتا تھا۔ یہی ارس برس بن کر سال والا مفہوم لئے ہوئے ہے اور مہینوں ہفتوں کی ایجاد سے پہلے لوگ برساتی حوالہ ہی سے وقت اور عمر شمار کرتے تھے اور برس سے سال اسی حوالہ سے مراد ہے۔

لیکن آ کے ساتھ ن بھی مل گیا تھا یا ملا لیا گیا تھا اور یوں آن x آن سے پانی بھی مراد ٹھہرا اور پانی سے حاصل ہونے والا رزق بھی چنانچہ ان داتا میں اَن سے رزق ہی مراد ہے اس سے لہٰذا میں آبی رزق ہی مراد تھا جو بارہ مہینے مل جاتا تھا اور کافی حد تک آسانی کے ساتھ۔ الف اور نون کی یہ دونوں آوازیں عجیب بات ہے عالمی حوالہ لئے ہوئے ہیں۔ چنانچہ

(Anadyr) ہے اور بلوچستان کے ایک دریا کو امبر (Amabar) کہا جاتا ہے۔ روسی اور بلوچی ناموں ہی کے حوالہ سے میرے خیال میں لفظ امبر (انبر) رہا ہوگا جس سے آسماں مراد ہے لیکن ابتداء میں اس سے وہ بلندی مراد تھی جدھر سے پانی برستا ہوا نظر آتا تھا۔ یاد رہے کہ ن اور ب کے درمیان میم کی آواز اکثر خود بخود شامل ہو جاتی ہے جیسے انگریزی لفظ کومب (Comb) اور ڈومب (Domb) وغیرہ میں "آن" میں موجود آبی حوالہ ہمیں ایران کے ایک آبی حوالہ کے نگر میں بھی ملتا ہے جسے انار (Anar) کہا جاتا ہے بلکہ ایک اور جگہ کو پانی ہی کے حوالہ سے انارک کہا گیا ہے اسی طرح افغانستان کی ایک جگہ کا نام انار درہ ہے تو ترکی میں اناتولیا (اناطولیا) آبی حوالہ کی جگہ ہے۔ سکاٹ لینڈ میں ایک خلیج کا نام انارد ہے تو فن لینڈ میں ایک ساحلی جگہ کو اناری (Enari) کہا جاتا ہے۔ ان جگہوں کو یہ نام اس لئے نہیں دیئے گئے تھے کہ وہاں انار ہوتے تھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انار کو انار اس لئے کہا گیا تھا کہ اس کے دانے رس والے یعنی پانی والے ہوتے تھے اور یہ نام گویا اس کی کنجی تھی کہ اس کے دانے پیاس کا علاج بن سکتے تھے انار ہی سے انار کلی کا نام سامنے آجاتا ہے۔ آج سے برسوں پہلے ڈاکٹر انیس ناگی نے اپنی ایک تصنیف "انار کلی حقیقت یا رومان" میں معلوماتی خلاصہ یوں پیش کیا تھا کہ عام روایت کے مطابق یہ مقبرہ مغلیہ دور کی ایک کنیز (انار کلی) کا مدفن ہے۔ انار کلی کا قصہ ناگی صاحب کی تحقیق کے مطابق کسی تاریخی یا انسانوں کی کتاب میں درج نہیں ہے اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ انار کلی کے حسب ونسب کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا اور اسے حسن وجمال کی وجہ سے انار کلی کا لقب دیا گیا تھا۔ جہانگیر کے کسی ہم عصر لکھنے والے نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اس کا واحد تاریخی ریکارڈ برطانوی سیاح اور تاجر ولیم فنچ کا وہ سفر نامہ ہے جو ہندوستان میں 1608 سے 1611 تک مقیم رہا تھا۔ لاہور میں اپنے قیام کے دوران اس نے جو کچھ سنا اس کو قلم بند کر دیا تھا۔ فنچ کے مطابق انار کلی اکبر کی ایک بیوی تھی جس کے بطن سے ایک لڑکا دانیال شاہ تھا اکبر کو جہانگیر یعنی اپنے بیٹے سلیم کے ساتھ انار کلی کے ناجائز تعلقات کا شبہ تھا جس کی پاداش میں اکبر نے اس کو قلعہ لاہور کی ایک دیوار میں چنوا دیا تھا۔ اور پھر جہانگیر نے تخت نشین ہونے پر انار کلی کی یاد میں ایک مقبرہ بنوا دیا۔ خیال رہے

فنچ نے یہ قصہ لاہوریوں سے سنا ہو گا یا بعض ایسے لوگوں سے جن کا ذہن داستان باف ہوتا ہے اور انار کلی کے کسی اور مفہوم تک نہ پہنچتے ہوئے وہ اسی طرح ایک داستان بنا کر مطمئن ہو گئے جس طرح میرے علاقہ کے عالمگیری دور کے مشہور فارسی شاعر ملا غنیمت کی مثنوی نیرنگ عشق میں لفظ ماجرا ابلہہ کا فرماجرائی سے ماجرہ گاؤں کا کوئی خوبصورت لڑکا مراد لے کر شاعر کی اس سے جذباتی وابستگی کا سراغ نکالا گیا تھا۔ پہلے بھی کسی حوالہ سے لکھا گیا ہے۔ اسی طرح انار کلی کی داستان میں دو سو سال بعد نور احمد چشتی صاحب نے اس قدر اضافہ کیا کہ محل سرا کی بیگمیں اس سے دشمنی رکھتی تھیں اور جب اکبر مہم دکن پر گیا اور وہ کسی مرض سے فوت ہو گئیں تو قبر اس کی پہلے بطور عام بنائی گئی اور دکن سے واپسی پر یہ مقبرہ بنوایا گیا۔ یہ اضافہ بھی ملتا ہے کہ انار کلی مسموم ہوئی ہو تو عجیب نہیں۔ اب اس تعویذ قبر پر لکھے گئے اسماء الٰہی کا بھی ذکر ملتا ہے اور سرہانے سلطان سلیم اکبر لکھا ہوا ہے لیکن ناگی صاحب نے نور احمد چشتی کی وضاحت کو سنی سنائی باتوں پر مشتمل قرار دیا ہے۔

1892ء میں سید عبداللطیف صاحب نے تاریخ لاہور میں یہ اضافہ کرنا ضروری جانا کہ ایک دن شہنشاہ نو عمر انار کلی کی معیت میں ایک ایسے کمرے میں آرام فرما رہے تھے جس میں آئینے نصب تھے انہوں نے انار کلی کا عکس دیکھا کہ اس نے شہزادہ سلیم کی مسکراہٹ کا جواب دیا تھا۔ اس شک کی بنیاد پر اسے زندہ در گور کر دینے کا حکم دے دیا گیا۔ سلیم کو اس کا دکھ رہا اور جب وہ حاکم بنا تو اس نے قبر پر عظیم الشان عمارت بنوائی۔ تابوت کا کتبہ سنگ مرمر کے ایک ہی ٹکڑے سے بنایا گیا تھا۔ اور اُسے کاریگری کا عمدہ نمونہ کہا جاتا ہے۔ کتبے کے شمالی حصہ پر "مجنوں سلیم اکبر کے الفاظ مندرہ ہیں اور یہ شعر بھی مرقوم ہے۔

تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

آہ اگر من باز بینم روئے یار خویش را

لیکن ناگی صاحب کی جیبی سائز کی چالیس صفحات کی کتاب میں ایک کتابتی غلطی چلتی آرہی ہے کیونکہ ص 14 پر لکھا گیا ہے کہ انار کلی کی موت سے متعلق تاریخ ہندسوں اور لفظوں میں 1008 ہجری (1599) دی ہوئی ہے یہ مقبرہ کی تعمیر کی تاریخ ہے اکبر 13 اکتوبر

تاریخوں میں سے اکبر کی تاریخ وفات چونکہ 1605ء میں تسلیم شدہ ہے اس لئے انار کلی کے مقبرہ کی تعمیر کو ہم اس کی موت کے دس سال بعد کی تسلیم نہیں کر سکتے کہ 1599ء میں دس جمع کریں تو حاصل جمع 1609ء بنتا ہے 1605 نہیں بنتا اور ایسی ہی غلطی اگر ہندسوں میں در آئی ہو اور چلتی رہی ہو تو ناممکن نہیں ہے اور تاریخ پکی گواہی نہ دیتی ہو تو انار کلی کی تاریخ وفات کو یقینی نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ ولیم فنچ کی مرقومات کو بھی اور ولیم فنچ یا نور احمد چشتی میں سے کسی ایک تک بات غلط رنگ میں پہنچتی ہو گی۔ اسی طرح اگر دانیال شاہ کی ماں دیوار میں چنوائی گئی تھی تو پھر انار کلی والی داستان بناوٹی لگتی ہے اور اس حوالہ سے باقی باتیں افسانہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ انار کلی کی ترکیب ہمیں پہلی بار فنچ کے سفر نامہ میں ملتی ہے اور مغالطہ کی جڑ لفظ انار (انار xاناراں) تھا۔ جسے ناگی صاحب نے بھی غیر مستحکم قرار دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں باغ انارہ (باغ اناراں) سے اناروں کا باغ مراد نہیں تھا بلکہ پانی کنارے کا باغ تھا۔ یا اس بستی کا باغ جسے انارہ کہا جاتا تھا اور لسانی حوالہ سے یہ بات درست لگتی ہے کہ جہاں آج یہ مقبرہ ہے اسے باغ اناراں کہا جاتا تھا اور سکینۃ الاولیاء کے مطابق اس مقام پر حضرت میاں میر جا کر بیٹھے تھے یا نہیں بیٹھتے تھے لفظ گواہ ہے کہ وہ باغ لب آب راوی تھا۔ اور ناگی صاحب نے بھی لکھا ہے کہ اس ہشت پہلو مقبرے کی جنوب کی جانب کچھ فاصلے پر راوی بہتا تھا۔ پانی کی اس قربت ہی کے باعث رنجیتی دور میں وہاں ایک چھاؤنی قائم کی گئی تھی کہ ہاتھیوں گھوڑوں کے ان ایام میں چھاؤنی دریا سے دور نہیں بنائی جا سکتی تھی اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے انار نام کی ایک بستی ایران میں بھی ہے ایک جگہ انار درہ ہے تو یہاں بھی اکبری ایام سے پہلے راوی کنارے کی کسی بستی کو انارہ نام دے دیا ہو تو ناممکن نہیں ہے۔

لیکن بات اصل میں کلی کی ہے جسے مقامی زبان کا لفظ جان کر دریابرد ہو جانے والی اس بستی کے گرد داستان کا تانا بانا بن دیا گیا تھا۔ ورنہ کلی وہی لفظ تھا جو آبی حوالہ کے ساتھ قلات (کلات) کا حصہ ہے ایران میں کلاچ کا حصہ ہے بلکہ روس میں دریا کنارے کی بستی کلاچ میں بھی موجود ہے۔ کالا باغ کے علاوہ یہ ہمارے دوآبہ کی بستی کالے کی کا حصہ ہے۔ یہی لفظ ہمیں کلا (کالا) کے روپ میں سویڈن میں رہائشی حوالہ لئے ملتا ہے اور اس کو Kula کی جگہ

شکل میں فارسی میں بھی ہے اور اردو میں بھی ہے جیسا کہ ہمارے ضلع کے شاعر چوہدری خوشی محمد ناظر نے جوگی نامہ میں باندھ ہے۔

اس کلہ کوہ پر رہتا تھا اک مست قلندر بے راگی

انارکلی سے بھی میرے خیال میں پانی کنارے کی بستی مراد تھی جسے ولیم فنچ نے غلط سمجھا اور اسے سچ دکھانے کے شوق میں داستان طرازی کر دی کہ سفرنامے آج کی طرح کل بھی اسی طرح دلچسپ بنتے تھے۔ اس کی مقامی زبان سے آگاہی کتنی ہو سکتی تھی اور تین ماہ میں اس نے فارسی یا کسی نامعلوم مقامی زبان میں کس قدر عبور حاصل کر لیا ہو گا اور اپنی ثانوی حیثیت کے باعث اس نے ثانوی حیثیت ہی کے لاہوریوں سے باتیں سن کر ان کو تاریخ کا حصہ بنا دیا تھا۔ یہاں وہ لوح مزار ضرور سوالیہ نشان بن کر آتا ہے جسے آصف جاہ اور شاہ جہانگیر کی قبر کے تعویذ کا ہم وضع بتایا گیا ہے اور تینوں پر ایک ہی تحریر کو حقیقت کی دلیل خیال گیا ہے لیکن ولیم فنچ کا تعویذ مزار پر اسماء الٰہی کا ذکر نہ کرنا شک کی گنجائش پیدا کرتا ہے کہ وہ تعویذ انیسویں صدی عیسوی میں کسی "کاریگر" نے لکھا ہو گا یا لکھ دیا ہو گا اور اسے شاہی حوالہ کی جگہ ظاہر کرنے کا مقصد مالی مفاد ہو گا جو شاید حاصل نہ ہو سکا۔ اور جس طرح کتابت ایک ایسا فن تھا جو صدیوں تک ہمارے ملک میں زندہ رہا اسی طرح لوح مزار لکھنا بھی ایک معقول آمدنی والا فن تھا اور مجھے شک کی اجازت دیں تو میں کہوں گا کہ بعض ارباب فن ہنگامی ضرورت کے پیش نظر ایسے تعویذ نامکمل سے بنا کر اپنے پاس رکھتے تھے جن کے پہلو کو کسی مرحوم یا مرحومہ کے نام سے فوری طور پر مخصوص کیا جا سکتا تھا اور یہ ایک ایسا ہی کتبہ تھا جس کے سرہانے سلطان سلیم اکبر لکھ کر کاتب نے اپنا پول کھول دیا تھا۔ کیوں کہ سلطان ہو جانے کے بعد سلیم نے کسی جگہ بھی اپنے آپ کو سلیم اکبر نہیں لکھا اور نہ ہی سلطان لکھا ہے اور 1611ء میں تو یہ بالکل ہی ممکن نہیں تھا کہ اسی سال اس نے نور جہاں کو لوح دل پر لکھ دیا تھا اور عورت میں رقابت مردوں سے زیادہ ہوتی رہی ہے۔ اسی طرح جہانگیر کی لاہور اور پنجاب سے جذباتی دلچسپی نہیں رہی تھی کہ اس کا بیٹا خسرو باغی ہو کر پنجاب ہی کی جانب بھاگا تھا اور پنجاب میں بھی سکھوں کے گوروار جن کو خسرو دوستی کی سزا میں جان سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ ہاں

جہانگیر کے کردار کو داغ دار دکھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ بات فچ نے بھی تو ر گزٹ سے سنی ہو گی کہ حاکموں سے اس قسم کا انتقام عوام لیتے آئے ہیں اور میرے بعض دوست جنہوں نے پہلوی دور میں ایران کا چکر لگایا تھا بتاتے تھے کہ وہاں غسل خانوں میں شاہ اور بانوی شاہ کے بارے میں بڑے بلیغ فقرے لکھے ہوئے ملتے تھے ایک کسی حد تک قابل تحریر تصنیف یہ تھی۔ ۔

بابانوی شاہ کردم شاہ ہم دید و خندید

اس طرح ہی سنگ مرمر کا پتھر سکھی اقتدار کے آغاز میں کسی نے لکھا اور اس جگہ کی زینت کر دیا جسے انار کلی کا مقبرہ کہا جاتا تھا اور اس سے مقصد یہی تھا کہ اہل اقتدار سے "ٹھگ مکا" ہو جائے اور عین ممکن ہے وہ ہو بھی گیا ہو کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور سے پہلے ہی بات کسی مرحلہ تک پہنچ گئی تھی۔

میری بد گمانی کا باعث یہ ہے کہ فچ (جسے پنجاب گزیٹئر میں ص 33 جلد دوم میں فچ (Fitch) لکھا ہے) خود کوئی اہم حیثیت والا شخص نہیں تھا اور کیپٹن ہاکنز کے ملازم کی حیثیت سے ہندوستان آیا تھا اور لاہور میں صرف تین ماہ رہا تھا۔ 1608ء سے 1611ء تک کے دورانیہ میں سے کسی سال کے تین ماہ کا اشارہ ناگی صاحب نے عنوان میں یوں کر دیا ہے کہ عنوان کے نیچے 1611ء لکھ دیا ہے یعنی اکبر کے فوت ہو جانے سے چھ سال بعد اور ان ایام میں جب جہانگیر کا بیٹا خسرو باغی ہو کر پنجاب کو بھاگ گیا تھا اور جب مقبول سکھ راہنما گوروارجن کو خسرو دوستی میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ ان حالات میں جہانگیر کے خلاف حق گوئی یا باطل گوئی کی فضا ساز گار تھی اور دونوں مظلوموں کے حامیوں کے لئے لب کشائی کی کافی گنجائش تھی اور کسی غیر ملکی کے ساتھ (اگر وہ مقامی زبان جانتا تھا) ایسی باتیں کرنے میں یہ اندیشہ نہیں تھا کہ رخت سفر باندھنے والا یہ انگریز لاہور سے آگرہ جا کر چغلی کھا جائے گا۔ فچ نے جہانگیر کے دامن پر جس داغ کا ذکر کیا ہے اس کا ایک پس منظر یہ بھی تھا کہ دانیال کی ماں شاہی حسب و نسب کی نہیں تھی اور عین ممکن ہے کہ وہ راوی کنارے کی بستی انارہ کلی ہی کی ہو اور اکبر کے دامن سے ان ایام میں وابستہ ہو گئی ہو جب وہ 1598ء تک کئی سال مسلسل

جہاں پہلے تو دانیال کو باگ ڈور دی گئی۔ لیکن وضاحت کے بغیر تاریخ کہتی ہے کہ وہی عنان دوسرے بیٹے مراد کو سونپی گئی۔ یہاں اس خلا کو خود پر کرنا پڑتا ہے کہ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگی ہونگیں کہ ایک عام سی عورت سے پیدا ہونے والے کو کتنا اہم مقام سونپ دیا گیا ہے اور مراد اکبر کی مجبوری تھا کہ وہ سلیم کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اس ناپسندیدگی کا ایک باعث یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سلیم نے والدہ دانیال کے ساتھ بے تکلف ہونا چاہا ہو کہ اس شنزادہ کے مزاج میں جذباتی بے لگامی موجود تھی جو اس لئے دب گئی کہ تخت اس کا ہی مقدر بن گیا تھا اور حرم شاہی میں لونڈیاں تیز نگاہ بھی ہوتی رہی ہیں اور تیز زبان بھی اور والدہ دانیال کی وفات کے بعد زبان کھل گئی ہو گی اور فنچ تک بھی بات پہنچ گئی ہو گی۔ ادھر مراد بیرم خاں کی اس بیوی کے بطن سے تھا۔ جو بیرم خاں کی بیوی تھی اور اس کی وفات کے بعد اکبر کے حرم میں داخل ہو گئی تھی اور یوں جب ہم دیکھتے ہیں کہ خان خاناں کی مراد سے بن نہ سکی تو وجہ سامنے آجاتی ہے۔ یہاں قدرت مداخلت کرتی ہے کہ مراد 1599ء میں جان کی بازی ہار جاتا ہے اور تاریخ کہتی ہے کہ زیادہ شراب پینے کے باعث کیوں کہ تاریخ زندہ وارثان تخت کے مطابق لکھی جاتی تھی یہی الزام تاریخ دانیال پر لگاتی ہے جو 1604ء میں رحلت کر جاتا ہے گویا سلیم میں یہ عیب نہیں تھا اور وہ زمزم پیا کرتا تھا۔

یہ ایک ضمنی سی بات کہہ دی گئی ہے ورنہ اس کا عنوان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اگرچہ تعلق بنتا بھی تھا کہ میرے خیال کے مطابق دانیال کی ماں انار کلی گاؤں کی رہنے والی تھی اسے اسی نام سے تحقیر کے طور پر بلایا جاتا ہو گا۔ چنانچہ تذکروں میں دانیال کی ماں کا ذکر نہیں ملتا۔ اور چونکہ وہ کسی حسب و نسب کی نہیں تھی اس لئے اسے گاؤں کے حوالہ سے پکارا جاتا ہو گا جس میں کلی گاؤں کو کلی یعنی غنچہ سے بدل کر ایک بات پیدا کر لی گئی ہو گی اور اگر وہ 1598ء کے بعد زندہ تھی تو ضرور اکبر کے ساتھ آگرہ گئی ہو گی اور اگر اس کے دن پورے ہو گئے تھے (اور میرا جھکاؤ اسی طرف ہے) تو پھر اسے لاہور ہی میں دفنا دیا گیا ہو گا اور شاید اس لئے کہ وہ انار کلی کی رہنے والی تھی۔ فنچ کے مطابق مقبرہ کے ارد گرد باغ بھی تھا اور چار دیواری بھی تھی اور وہ مقبرہ بھی مقبرہ انار کلی ہی کہا گیا ہو گا جس کا مفہوم دھند لکے میں کھو جانے سے

ڈاکٹر انیس ناگی اور دوسرے ماہرین نے اس پر اتفاق کیا ہے کہ انارکلی والا تعویذ مزار کسی ایک کاریگر نے یا اس کے شاگردوں نے سنگ مرمر سے بنایا تھا اس امکان کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ کسی ایک استاد کے ذہین شاگرد نے ہی آصف جاہ والا تعویذ 1611 میں لکھا ہو (جسے ناگی صاحب کے مقالہ میں 1631 لکھا گیا ہے) اور جہانگیر والا کتبہ بھی 1627ء میں اسی نے لکھا ہو اور انہیں ایام میں انارکلی والا کتبہ بھی مرحومہ کی وفات کے بعد کسی ایسے با اقتدار اور با اختیار نے لکھوا دیا ہو جسے آصف جاہ کے ساتھ دلی تعلق تھا لیکن انارکلی کے ساتھ بھی دانیال کی والدہ کے حوالہ سے بھی ہو سکتا تھا۔ وہ کون ہو سکتا ہے اس کو میرا ذہن تلاش نہیں کر سکا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مغلیہ اقتدار کے زوال کے ایام میں جب نادری اور ابدالی یلغاروں کے ساتھ سکھی یلغاریں بھی شروع ہو گئی تھیں سنگ نویسوں کو مرمری سلیں آسانی سے مل گئی ہوں گی جن کو انہوں نے نیم تیار حالت میں ضرورت کے لئے رکھ لیا ہو گا جس طرح آج بھی یہ کام کرنے والے کرتے ہیں ایسی ہی سلوں میں سے ایک سل انارکلی کے سنگ مزار کی زینت بن گئی ہو گی۔ مقبرہ کی صورت میں اس پر اپنا قبضہ اور اس سے اپنا تعلق جتانے کے لئے یا ضرورت کے مطابق مک مکا کرنے کے لئے۔ چونکہ 1947ء میں تبادلہ اقتدار کے ساتھ راقم کو معلوم ہے کہ ایک قبضہ گروپ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لئے قیاس کہتا ہے کہ 1849ء میں بھی ضرور ایک قبضہ گروپ ابھر آیا ہو گا جس نے بہت سی غیر اہم اور غیر تاریخی عمارتوں کے ساتھ اس عمارت کے سلسلہ میں بھی مطلب براری کی ہو گی اور گوجر سنگھ، صوبہ سنگھ اور لہنا سنگھ کے یلغاری ایام میں جب لاہور کو تین حصوں میں بانٹ لیا گیا تھا۔ انارکلی والی جگہ ان کی نگاہوں سے کیسے بچ سکتی تھی۔ یہ میرے قیاس کی ایک کڑی یا ایک لڑی ہے جس پر مزید سوچنے کی ضرورت ہے اور اس پس منظر کے ساتھ کہ چارلز ہوگل نے اپنے سفرنامہ کشمیر و پنجاب میں (جو رنجیتی دور کی داستان ہے) انارکلی کی رومانی داستان کا ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ لاہور کے بٹوارے کا ذکر کرتا ہے۔ اسی طرح جنرل ونتورا کی اس رہائشی جگہ کا بھی اس نے ذکر کیا ہے جسے ڈاکٹر انیس ناگی صاحب نے مقبرہ انارکلی بنایا ہے۔ ہوگل نے اسے مقبرہ ہی لکھا ہے لیکن اسے انارکلی سے منسوب نہیں بتایا۔ مجلس ترقی ادب کی جانب سے شائع کئے

کے اوپر بہت بلند گنبد ہے۔ فی الوقت اسے یورپین افسروں کے قبیلوں نے رہائش کے لئے
لے رکھا ہے۔چونکہ یہ ایک باغ کے عین درمیان میں واقع ہے جسے نہایت ذوق اور سلیقے سے
لگایا گیا ہے اردگرد کے ریگستانی میدان کے مقابلہ میں اس کا منظر قابل دید ہے اس مقام سے
راوی کی ایک شاخ کا نظارہ کیا جاسکتا ہے مشرق کی جانب پرانا شہر ہے اور گورستان دکھائی دیتا
ہے۔ آگے چل کر یوں مرقوم ہے کہ کھنڈرات کے درمیان جنرل ونٹورا کے مکان کے
سامنے زمین کا ایک مربع رقبہ صاف کر لیا گیا ہے جہاں فوجی دستے اپنی مشقیں کرتے ہیں'
یعنی اہم بات یہ ہے کہ ہوگل نے اسے مقبرہ تو کہا ہے مگر انارکلی کا مقبرہ نہیں کہا ہے اور
مقبرہ پر کے لوح مزار پر اسماء الہی کا ذکر بھی نہیں ہے نہ ہی یہ مذکور ہے کہ وہ سنگ مزار
یعنی اصل تعویذ مقبرہ کو مشرق کی طرف کر دیا گیا ہے جس پر بقول عبداللہ چغتائی صاحب
99 اسمائے الہی بھی کنندہ ہیں اور اس سے میرے دل میں شک جاگتا ہے کہ یہ سارا کارنامہ
سکھی دور میں کسی مفاد کے پیش نظر کیا گیا تھا اور لوح مزار نصب نہیں کیا گیا تھا۔ تیار کر کے
وہاں قبضہ کے ثبوت میں رکھا گیا تھا۔ جہانگیری' آصف خان اور انارکلی والے کتبوں کا ہم قلم
ہونا ایک قیاس ہے کہ ہڑپہ اور موہنجوداڑو کے ایک دوسرے سے مکانی فاصلہ کے باوجود اور یہ
نہ مانتے ہوئے کہ دونوں جگہوں میں زمانی فاصلہ کس قدر تھا۔ پھر بھی اسے ایک دوسرے سے
اس قدر دور ضرور گنا جاسکتا ہے جس قدر جہانگیری دور اور سکھی دور ایک دوسرے سے دور تھا
اور انگریزی روزنامہ "دی نیوز" کے 6 اکتوبر 1995ء کے شمارہ میں جعفر حمید صاحب کا یہ
فقرہ توجہ طلب ہے کہ

Harappa located near the town of sahiwal is laid
out in almost precisily the same fashian as mohenjodoro

اور اگر ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور کے دو قصبوں کے کاریگر صدیوں بعد ہم
رنگ و ہم فن ہو سکتے تھے تو یہی بات مقبرہ جہانگیر' مقبرہ آصف خان اور مقبرہ انارکلی پر بھی
صادق آسکتی ہے اور ہمیں اس سلسلہ میں مزید تحقیق کی ضرورت ہے اور انارکلی کے اس
مفہوم کے پس منظر میں جو میں نے پیش کیا ہے عینیوال کے حافظ صاحب نے بھی نکتہ
مناسب ہی اٹھایا تھا کہ عینیوال سے پانی والی جگہ بھی مراد ہو سکتا تھا اور اسی حوالہ سے عربی میں

چشمہ کو عین کہا جاتا ہے بلکہ آنکھ کو بھی عین اسی لئے کہا جاتا تھا کہ اس میں سے پانی بہتا تھا۔ انگریزی میں آنکھ بھی اسی لئے آئی (eye) کہلائی تھی اور اس کی اصل وہی آئیس لینڈ والا لفظ آ تھا جس سے ندی اور پانی والی جگہ مراد تھی۔ اسی آئی (Eye) سے آئینہ بنا تھا کہ انسان نے اپنی صورت پانی ہی میں پہلی بار دیکھی تھی اور یونانی روایات کے مطابق اس خوبصورت دیوتا کا نام نرسیوس (Narcisus) تھا جس کو ہم نرگس کہتے ہیں اور وہ اپنی شکل پر اس قدر فریفتہ ہو گیا تھا کہ پانی سے ہٹنا اسے گوارا نہیں تھا کہ یوں صورت غائب ہو جاتی تھی اور اس طرح اس نے جان دے دی۔ نرگسیت سے اسی لئے اپنی خوبی کا مسلسل ذاتی اظہار مراد لیا گیا ہے اور ایک ایسی پیاس جس کی تسکین نہیں ہوتی۔ اچھے اور ان کے اس پس منظر میں یہ سراغ لگانے کی بھی ضرورت ہے کہ انڈیا کو انڈیا (انڈیا) کیا اس لئے تو نہیں کہا گیا تھا کہ اس خطہ کے اندر بھی دریا ہی دریا تھے اور باہر بھی یہ پانی سے گھرا ہوا تھا یا آریاؤں کے کسی قافلے نے اسے ہندوستان کہا ہو کیوں کہ آئیس لینڈ میں Oustan سے مشرق کی جانب مراد ہے اور یوں اندوستان سے وہ جگہ مراد تھی جو اند یعنی دریائے سندھ کی مشرق جانب تھی۔ بعد میں مختلف قبائل کے آنے اور ایک دوسرے کے ساتھ غلط ملط ہو جانے سے مفہوم بھی غلط ملط ہو گیا اور یہ پہچان نہ رہی کہ کون سا لفظ کیا مفہوم لئے ہوئے تھا۔ ہم نے یہ تو یاد رکھ لیا کہ اندر بارش کا دیوتا ہے لیکن اس کا آ (a) اور انڈ (and) کے ساتھ تعلق بھول گئے۔ ورنہ اگر اندر کو دیوتاؤں کا راجہ کہا گیا تھا تو اس لئے کہ پانی ہی انسانی زندگی میں مہاراج رہا ہے اور اس مہاراج کے روٹھنے سے بلوچستان میں جو قیامت آئی ہے وہ اسی کی دلیل ہے۔

قصہ مختصر "اچھے" سے پانی والی جگہ مراد تھی اور یہ مفہوم اس لفظ اور اس بستی کو کسی ایسے قبیلے نے دیا ہو گا جن کی بولی میں یہ لفظ ان معنوں میں برتا جاتا ہو گا اور چونکہ میری معلومات کے مطابق اس کا سراغ سکینڈ نیویائی علاقہ کی طرف جاتا ہے اس لئے میرے خیال میں یہ نام ادھر ہی سے ادھر آیا ہو گا۔ ورنہ اگر اس بستی والوں کو معلوم ہوتا کہ اچھے سے پانی مراد ہے تو وہ کبھی بھی اس بستی کو اس نام سے نہ پکارتے۔ آنکھ کے ڈھیلے کو ہم "آنہ" اسی آئی حوالہ سے کہتے ہیں کہ قدیم ایام میں بظاہر آنسو اسی میں سے بہتے نظر آتے تھے اور یہ لفظ

یوں یہ بستی قریب لیام کی نہیں بعید لیام کی معلوم ہونے لگتی ہے اور دوابے کی تاریخ کو ہمارے عام اندازوں سے بہت دور لے جاتی ہے کہ معلوم لیام میں ہمیں تاریخ نہیں بتاتی کہ ہم جنوبیوں کا کبھی شمالیوں سے گہرا رابطہ رہا ہو بالخصوص آئیس لینڈ والوں سے جنہوں نے ہمیں کتنے ہی الفاظ ہماری بولی کا حصہ بنائے۔ چنانچہ کویداں بمعنی نظم ہی سے میرے خیال میں کویتا بنا تھا۔ اسی طرح سجا (Sja) سے وہاں دیکھنا مراد ہے جس سے ہماری طرف "سجاکھا" (یعنی جو دیکھ سکتا ہے) بنا۔ نا (na) سے وہاں پکڑنا حاصل کرنا اور پہنچنا مراد ہے جس سے ہم نے ناؤ بنالیا کہ اس میں یہ تینوں مفہوم پوشیدہ ہیں۔ یہاں باوا فرید کی ایک بانی یاد آجاتی ہے۔ سائیں باجھوں اپنے دیدن کیئے کس۔ اس مصرع میں دیدن وی لفظ ہے جو ہمیں آئیس لینڈ میں بیدا بمعنی التجا کے روپ میں ملتا ہے میرا جھکاؤ ادھر بھی ہے کہ آئیس لینڈی لفظ براتا (baratta) ہی سے وارتا بمعنی جنگ بنا ہوگا کہ براتا سے وہاں لڑائی ہی مراد ہے اور مہابھارت اصل میں مہاوارتا ہی ہوگا اور اس سے وہ جنگ عظیم مراد تھی جو کورد اور پانڈو کے درمیان چھڑی تھی۔

نامانوس اور متروک ہو گئے لفظوں کے معنی تلاش کرنا اصل میں کسی دشت بے راہ میں سفر کرنا ہے جس میں بے راہروی کے امکان سے بچا نہیں جاسکتا اور میرے پیش کئے گئے قیاسات بھی اہل فکر کے لئے دعوت تحقیق ہیں۔